پروفیسر حافظ احمد یار

سورۃ البقرۃ (۱۷)

(آیات ۲۱-۲۲)

(گزشتہ سے پیوستہ)

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کے لیے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کیے گئے ہیں سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیرِ مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحثِ اربعہ (اللغۃ، الاعراب، الرسم اور الضبط) میں سے زیرِ مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے یعنی علی الترتیب اللغۃ کے لیے ۱، الاعراب کے لیے ۲، الرسم کے لیے ۳ اور الضبط کے لیے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے بحث اللغۃ میں چونکہ متعدد کلمات زیرِ بحث آتے ہیں اس لیے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لیے نمبر کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲:۵:۱ (۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرۃ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲:۵:۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

۲:۱۶:۲ الإعراب

زیرِ مطالعہ یہ دو آیات بنیادی طور پر چھ جملوں پر مشتمل ہیں جن میں سے بعض جملے صلہ کا کام دیتے ہیں اور صلہ موصول مل کر جملے کا ایک حصہ بنتا ہے۔ اور بعض جملے واو عاطفہ اور فاء عاطفہ کے ذریعے باہم ملائے گئے ہیں جس سے ایک مربوط لمبا جملہ بنتا ہے۔ تفصیل یوں ہے:

(۱) یاایھا النـاس ہیں [یاایھا] حرف نداء ہے اور [النـاسُ] منادیٰ مفرد ہونے کے باعث مرفوع ہے۔

نحویوں کے نزدیک یہاں حرفِ ندا (یاایھا) یَا + اَیُّ + ھا کا مرکب ہے۔ میں اصل حرف ندا تو " یَا " ہی ہے۔ " اَیُّ " منادیٰ (اور مبنی برضمہ) ہے۔ اور نحوی اسے (منادیٰ مضاف کی طرح) محلاً منصوب شمار کرتے ہیں اور اس کے بعدِ " ھَا " (ضمیر نہیں بلکہ) حرفِ تنبیہ ہے (دیکھیے اوپر ۲:۱۶:۱ (۱) میں)

● تاہم عملاً اور فعلاً یہ صورت ہے کہ یہ سارا مرکب (یاایّھا) حرفِ نداء کا ہی کام دیتا ہے۔ یہ صرف معرف باللام منادیٰ پر داخل ہوتا ہے۔ اور مذکر مؤنث کے لیے اس کے الگ الگ صیغے ہیں (ایّھا اور ایّتھا) ۔اس طرح یہاں لفظ (الناس) نحویوں کے نزدیک اصل منادیٰ (اَیُّ) کا بدل یا اس کی صفت ہے۔ مگر — فنّی باریکی برطرف — سیدھی سی بات یہی ہے کہ یہی (الناس) ہی یہاں منادیٰ ہے۔ اگر یہ بدل یا صفت ہوتا تو اس کا لانا لازمی نہ ہوتا۔ مگر اس کے لائے بغیر " منادیٰ " کا مفہوم ہی نہیں بنتا۔ پس " یاایھا النـاسُ " کا نحوی ترجمہ "اے تو/ وہ جو لوگ ہو" کی بجائے سیدھا با محاذرہ اردو ترجمہ ہوگا۔ " اے لوگو ! " یا صرف " لوگو ! " —

(۲) اعبـدوا ربکم الـذی خلقکم والـذین من قبلـکم۔

[اعْبُدُوا] فعل امر معروف کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہے۔ جس میں " و " فاعل کی ضمیر مستتر (انتم) کا کام دے رہی ہے یعنی " تم عبادت کرو "۔ [رَبَّکُم] یہ مضاف (ربّ) اور مضاف الیہ (ضمیر مجرور " کُمْ ") مل کر فعل " اعبدوا " کا مفعول بہ ہے اور اس لیے منصوب ہے۔ اس میں علامتِ نصب " ربَّ " کی باء (ب) کی فتحہ (ـَـ) ہے۔ [الَّـذِی] اسم موصول ہے جو اپنے صلہ (مابعد آنے والے اگلے جملہ) کے ساتھ مل کر " ربّکم " کی صفت بنے گا۔ اس طرح یہاں " الـذی " دراصل منصوب ہی ہے۔ اگرچہ مبنی ہونے کے باعث اس میں کوئی علامتِ اعراب ظاہر نہیں ہے [خلقکم] میں " خلَقَ " تو فعل ماضی معروف ہے، جس میں

ضمیر فاعل " ھُوَ " مستتر ہے اور " کُمْ " یہاں ضمیر متصل منصوب اس فعل (خلق) کا مفعول بہ ہے اور یہ جملہ (خلقکم) الذی کا صلہ ہے ۔ اس طرح "الذی خلقکم" (وہ جس نے کہ پیدا کیا تم کو) صلہ موصول مل کر " ربّکم " کی صفت ہے ۔ [والذین] میں " وَ " تو عاطفہ (بمعنی " اور ") ہے اور " الذین " اسم موصول معطوف ہے ۔ اس کا عطف " خلقکم " کی ضمیر منصوب " کُمْ " پر ہے یعنی بلحاظ معنی تقدیر عبارت (UNDERSTOOD) یوں ہے :" وَ (خلق) الذین " [من قبلِکم] میں " مِنْ " حرف الجر " قبلِ " ظرف (مجرور بوجہ " مِنْ ") مضاف ہے اور " کُمْ " مضاف الیہ ضمیر مجرور ہے یعنی " تم سے پہلے " (ہوئے ہیں) ۔ اور یہ مرکب جارّی (من قبلکم) " الذین " کا صلہ ہے ۔ اور یہ صلہ موصول مل کر (الذین من قبلکم) "خلقکم" کی ضمیر منصوب مفعول بہ (کُمْ) پر عطف ہے ۔ یعنی " خلقکم و (خلق) الذین من قبلکم " (اس نے پیدا کیا تم کو اور ان کو (بھی پیدا کیا) جو تم سے پہلے (ہوئے) تھے) ۔

(۳) لَعَلَّکُمْ تتقون :۔ میں [لعلّ] حرف مشبہ بالفعل ہے جو " ترجّی اور توقع " یعنی " شاید کہ " ، " امید ہے کہ " کے معنی دیتا ہے ۔ اور [کم] اس " لَعَلَّ " کا اسم (لہذا) منصوب ضمیر ہے اور [تتقون] فعل مضارع معروف صیغہ جمع مذکر حاضر ہے ۔ جس میں ضمیر فاعلین " انتم " مستتر ہے اور یہ (تتقون) ایک مکمل جملہ فعلیہ ہے جو " لعلکم " کی خبر کا کام دے رہا ہے ۔ (یعنی امید ہے کہ تم بچو گے) ۔ اور یہ پورا جملہ (لعلکم تتقون) یہاں ایک طرح سے فعل امر (اعبدوا) کے جواب میں " جواب شرط " کے مفہوم میں آیا ہے ۔ یعنی یہ ایک الگ مستقل جملہ ہے ۔ اپنے سے سابقہ جملے (یاایھا الناس ...... قبلکم) کا کوئی نحوی جزء یا حصہ نہیں ہے ۔

(۴) الذی جعل لکم الارض فراشا والسماء بناءً :۔

[الذی] اسم موصول ہے جو بعد میں آنے والے " صلہ " سمیت سابقہ آیت

کے " ربّکم " کی دُوسری صفت (پہلی صفت " الـذی خلقکم والـذین من قبلکم " تھی جیساکہ اوپر (۲) میں بیان ہُوا ہے) یا بدل ہونے کے باعث محل نصب میں ہے ــــ اور چاہیں تو یہاں (الـذین سے) شروع ہونے والے (صلہ موصول) جملے کو ایک محذوف مبتدأ (ھُوَ) کی خبر (لہذا محلاً مرفوع) بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ [جَعَل] فعل ماضی ہے جس میں ضمیر فاعل " ھُوَ " مستتر ہے۔ اور یہاں (جعل) سے اسم موصول (الـذی) کا صلہ شروع ہوتا ہے۔ [لَـکُم] جار مجرور متعلق فعل (جعَل) ہے یعنی "بنایا / پیدا کیا تمہارے لیے" ــــ [الارض] فعل " جَعَل " کا مفعول اوّل اور [فراشًا] اس کا مفعول ثانی ہے۔ اور یہ اس صورت میں ہے اگر جعل کے معنی " بنانا " مقرر لیے جائیں۔ لیکن اگر فعل " جَعَل " بمعنیٰ " پیدا کرنا " لیا جائے تو پھر " الارضَ " اس کا مفعول اور " فراشا " اس (مفعول یعنی الارض) کا حال ہو سکتا ہے۔

اسی طرح [والسماءَ] کا " السماء " بھی (واو تو عاطفہ ہے) اسی " جعل " بمعنی بنانا کا مفعول اوّل اور [بناءً] مفعول ثانی ہے یعنی اس کا عطف " فراشا " پر ہے ــــ اور یہاں بھی اگر " جعَل " بمعنی " خلَق " (پیدا کیا) لیا جائے تو پھر " السماء " کو مفعول اور " بناء " کو اس (مفعول) کا حال کہہ سکتے ہیں ــــ تاہم اردو میں محاورے کی خاطر پہلے معنی (مفعول اوّل اور ثانی والے) کے ساتھ ترجمہ کرنا زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے (یعنی اس نے بنایا تمہارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت)۔ کیونکہ دُوسری ترکیب (حال والی) کے ساتھ ترجمہ (اس نے پیدا کیا تمہارے لیے زمین کو فرش ہوتے ہوئے اور آسمان کو چھت ہوتے ہوئے) بے محاورہ اور عجیب سا لگتا ہے۔ اردو محاورے کے لحاظ سے " لکم " کا ترجمہ پہلے اور " جعل " کا ترجمہ سب سے آخر پر ہونا چاہیئے (یعنی " جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا ") تاہم بیشتر مترجمین نے کلمات کی عربی ترتیب کو ملحوظ رکھتے ہوئے " جعل " کا ترجمہ شروع میں کر دیا ہے۔ " جس نے بنایا ...... "۔ بعض مترجمین نے " کو " کی بجائے " زمین

کا فرش " اور "آسمان کی چھت " (بنائی) سے ترجمہ کیا ہے جو عربی ترکیب عبارت سے بعید ہے۔ اگرچہ مفہوم و محاورہ کے لحاظ سے غلط نہیں ہے۔ اسی طرح بعض حضرات نے " فراشا " اور " بناء " کی تنکیر (نکرہ ہونا) کا لحاظ رکھتے ہوئے " ایک فرش " اور " ایک چھت " کے ساتھ ترجمہ کیا ہے جو زیادہ بہتر ہے۔

(۵) وانزل من السماء ماءً:-

[وَ] عاطفہ بمعنی " اور " ہے اور [انزل] فعل ماضی معروف صیغہ واحد مذکر غائب ہے جس میں ضمیر فاعل " ھو " مستتر ہے اور یہ فعل (انزل) سابقہ فعل " جعل " پر عطف ہے یعنی " بنایا .... اور اتارا ..... " [مِنَ السماءِ] جارّ (مِنْ) اور مجرور (السماءِ) مل کر فعل " انزلَ " سے متعلق ہیں [یعنی اتارا۔ کہاں سے ؟ اور جواب ہے " آسمان سے "] ـــــ اس کے بعد [ماءً] فعل " انزل " کا مفعول بہ (لھذا) منصوب ہے جس کی علامت نصب آخری " ء " کی تنوین نصب (ـً) ہے۔ یہ جملہ سابقہ جملہ پر عطف ہے

(۶) فَاَخْرَجَ بِہٖ من الثمراتِ رزقًا لکم:

[فَاَخْرَجَ] میں فاء (فَ) عاطفہ ہے جس کا ترجمہ یہاں " پس یا چنانچہ " سے ہوسکتا ہے اور " اَخْرَجَ " سابقہ (حصۂ آیت) کے فعل " اَنْزَلَ " پر عطف ہے۔ یعنی " اتارا پس نکالا " [بِہٖ] جار (بِ) اور ضمیر متصل مجرور (ہ) مل کر فعل " اَخْرَجَ " سے متعلق ہیں اور یہاں یہ (بِ) سببیہ ہے یعنی " نکالا اس کے ذریعے سے یا اس کے سبب سے " اور ضمیر مجرور (ہ) کا مرجع " ماءً " ہے (دیکھئے مندرجہ بالا ۵) یعنی " اس پانی کے ذریعے نکالا " [من الثمرات] یہ جار (مِنْ) اور مجرور (الثمرات) مل کر فعل " اخرج " کے مفعول کی جگہ لے رہا ہے۔ اس لیے اسے محلاً منصوب بھی کہہ سکتے ہیں۔ گویا دراصل " اخرج الثمراتِ " (اس نے پھل نکالے) تھا پھر " الثمرات " پر " مِنْ " لگا ـــــ اب اگر اس " مِنْ " کو تبعیض کا مانیں تو ترجمہ ہوگا " پھلوں میں سے بعض " اور اگر " مِنْ " کو بیانیہ سمجھا جائے تو ترجمہ ہوگا " قسم قسم کے پھل "۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مترجمین نے " مِن " کی تبعیض کی بناء پر

"من الثمرات" کا ترجمہ "کچھ پھل" کیا ہے۔ اور بعض نے "مِن" کو بیانیہ سمجھتے ہوئے "انواع واقسام کے پھل" ترجمہ کیا ہے۔ اور اکثر مترجمین نے اس "مِنْ" کو نظر انداز کرتے ہوئے "من الثمرات" کا ترجمہ صرف "پھل" یا "میوے" کر دیا ہے۔ یہ محاورہ اور مفہوم کے لحاظ سے تو درست ہے۔ تاہم "مِن" کو شامل کرنے والا ترجمہ بہتر قرار دیا جا سکتا ہے۔

[رِزْقًا] یہ فعل "اخرج" کا مفعول لہ ہے یعنی "برائے رزق"، "روزی کے لیے"۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسے (رزقًا کو) فعل "اَخْرَجَ" کا مفعول بہ مانیں اور "من الثمرات" کو اس کا بیان یا وضاحت سمجھ لیں، تو ترجمہ ہوگا "اس نے نکالا کچھ رزق از قسم میوہ جات"۔ اردو مترجمین میں سے بعض نے مفعول لہ کے ساتھ ترجمہ کیا ہے یعنی "کھانے کو، غذا کو" (یعنی کے طور پر)۔ جب کہ بعض نے مفعول بہ سمجھ کر "نکالا رزق، نکالا کھانا" سے ترجمہ کیا ہے۔ ہمارے خیال میں مفعول لہ والی ترکیب کے ساتھ ترجمہ کرنا زیادہ بہتر ہے۔ [لَکُمْ] جار مجرور (لِ + کُمْ) ایک طرح سے "رزقًا" (نکرہ موصوف) کی صفت کا کام بھی دے سکتا ہے یعنی "وہ رزق جو تمہارے لیے ہے"۔ جن حضرات نے "رزقا" کا ترجمہ مفعول بہ سمجھ کر "رزق یا کھانا" کیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مفعول لہ سمجھ کر ترجمہ "(ارزق/روزی) کھانے کے لیے" کے ساتھ ہی "لکم" کا ترجمہ بھی "تمہارے لیے" کرنے سے پورا ترجمہ بنتا ہے "کھانے کے لیے تمہارے لئے"۔ اس کی اردو محاورے میں گنجائش نہیں۔ اس لیے انہوں نے "رزقًا" کو مفعول بہ بنا کر ترجمہ کر دیا "کھانا تمہارے لیے"۔ اور بعض نے "لکم" کا ترجمہ نظر انداز کرتے ہوئے صرف "تمہارے کھانے کو" کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔ یعنی مفعول لہ ہی سمجھ کر ترجمہ کیا ہے۔ یہ جملہ بھی بذریعہ "فاء" سابقہ جملہ (۵) پر عطف ہے۔

(۷) فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ:

[فَلَا تَجْعَلُوا] میں ابتدائی فاء (فَ) یہاں عاطفہ مگر تعلیل (وجہ بتانا) کے معنوں میں ہے۔ اس کا اردو مفہوم "پس اس بناء پر" یا لهذا (اس لیے)

بنتا ہے ۔ " لا تجعلوا " فعل نہی معروف کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہے ۔ جس میں " لائے نہی " کے باعث مضارع مجزوم ہو کر اس کا آخری " ن " گر گیا ہے ۔ اور اس میں ضمیر فاعلین " انتم " مستتر ہے ۔ جس کی علامت " تجعلوا " کی " واو " ہے ۔
[لِلّٰہ] جار مجرور مل کر فعل " لا تجعلوا " کے مفعول ثانی کی جگہ لے رہا ہے ۔
اور [انداداً] اس کا مفعولِ اول ہے ۔ گویا تقدیر (اصل) عبارت یوں تھی " فلا تجعلوا انداداً للہ " ۔ اور " لِلّٰہ " کا ترجمہ " اللہ کے لیے " کی بجائے " اللہ کا " بھی ہو سکتا ہے اس لیے بعض حضرات نے " لا تجعلوا للہ انداداً " کا ترجمہ " نہ ٹھہراؤ تم اللہ کے ہم سر " یا " تم اللہ کے ہمسر نہ ٹھہراؤ " سے کیا ہے ۔ اور یہ الفاظ سے قریب تر ہونے کے باعث بہت درست ترجمہ ہے ۔ بعض نے یہاں " لا تجعلوا " کا ایک (پہلا) مفعول محذوف مان کر ۔ اور " انداداً " کو مفعول ثانی سمجھ کر ترجمہ کیا ہے ۔ گویا تقدیر (اصل) عبارت کچھ یوں بنائی ہے — " لا تجعلوا — " احداً " یا " مخلوقاً " — انداداً للہ " (رو یے چونکہ " انداداً " جمع ہے اس لیے محذوف مفعول اول " احدا " یا اس کی بجائے " مِنْ احدٍ " (کوئی بھی) یا " اٰلِھَتَکم " (اپنے معبودوں کو) سمجھا جا سکتا ہے) اس طرح ترجمہ ہو گا " کسی کو " یا " کوئی " نہ بناؤ اللہ کے ہم پلہ ، ہم سر ، برابر والے کے مقابل " — اور یہی وجہ ہے کہ بہت سے مترجمین نے ان الفاظ (" کسی کو " اور " کوئی ") کے اضافہ کے ساتھ ترجمہ کیا ہے ورنہ آیت میں تو اس کے لیے کوئی لفظ نہیں ہے ۔ یہ محذوف مفعول کا ہی ترجمہ ہو سکتا ہے جو بلحاظ مفہوم درست ہے ۔ اگرچہ اصل (عبارت) پر ایک اضافہ ہے ۔ اور اس اضافہ کے بغیر والا ترجمہ (تم اللہ کے ہمسر نہ بناؤ) زیادہ بہتر ہے ۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے [وَ] اس " واو " کو یہاں عاطفہ (بمعنی " اور ") بھی کہہ سکتے ہیں اور حالیہ (بمعنی " حالانکہ ") بھی ۔ اور اس کے بعد [اَنْتُم] ضمیر مرفوع منفصل مبتدأ ہے (اسی لیے مرفوع ضمیر لائی گئی ہے) ۔
[تَعْلَمُوْن] فعل مضارع معروف مع ضمیر فاعلین " انتم " ۔ یعنی صیغہ جمع مذکر

حال ہے اور یہ پورا جملہ فعلیہ (تعلمون) "انتم" (مبتدأ والا) کی خبر ہے پھر یہ پورا جملہ اسمیہ ہو کر (انتم تعلمون) حال ہونے کی بنا پر (اگر "واو" کو حالیہ سمجھا جائے تو) محل نصب میں ہے۔ اسی لیے اردو کے بعض مترجمین نے اس (وانتم تعلمون) کا ترجمہ "جان بوجھ کر" یا "جانتے بوجھتے ہوئے" سے کیا ہے۔ اگرچہ بعض نے "واو" کو عاطفہ سمجھ کر سیدھا ترجمہ "اور تم جانتے ہو" سے بھی کر دیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہاں "واو" کو حالیہ سمجھنا زیادہ موزوں ہے۔

۲ : ۱۶ : ۳ الرسم

ان دو (زیر مطالعہ) آیات کے قریباً تمام کلمات کی املاء معتاد (عام عربی املاء) اور رسم عثمانی ایک جیسا ہی ہے۔ البتہ صرف تین کلمات "یاایھا"، "فراشًا" اور "الثمرات" کا رسم قابل ذکر ہے۔

(۱) حرف نداء "یاایھا" کو ہمیشہ "یایھا" لکھا جاتا ہے۔ یعنی شروع کے "یا" کو بحذف الف ہی لکھا جاتا ہے پھر اس پر علامت ضبط ڈال کر اس کا تلفظ "یا" ہی رہتا ہے۔ اور اس "ی" کو "ایھا" کے ابتدائی ہمزہ (بصورت الف) کے ساتھ ملا کر لکھا جاتا ہے۔ یعنی "یایّھا" کی صورت میں۔ اسے الگ الگ "یاایھا" لکھنا غلط ہے۔ مگر ترکی اور ایران کے مصاحف میں یہ غلطی عام ہے۔ اور اس (کلمۂ ندا) کی عام عربی املاء بھی یہی (یایھا) ہے جو عربی املاء پر رسم عثمانی کے اثرات کا ایک مظہر ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ رسم عثمانی کے مطابق حرف ندا "یا" ہر جگہ بحذف الف ہی لکھا جاتا ہے (چاہے ساتھ "ایھا" ہو یا نہ ہو) مثلاً قرآن مجید میں "یموسی" اور "یاھل الکتاب" ہی لکھا جاتا ہے اگرچہ عام عربی املاء میں اسے "یا موسی" اور "یااھل الکتاب" لکھا جاتا ہے۔

(۲) کلمہ "الثمرات" کے بارے میں علمائے رسم کا اتفاق ہے کہ یہ لفظ قرآن کریم میں — یہاں اور ہر جگہ — "بحذف الف بعد الراء" لکھا جاتا ہے یعنی بصورت

" الثمرت " ۔ پھر بذریعہ ضبط اس محذوف الف کو تلفظ میں لایا جاتا ہے ۔ یعنی یہ الف (بعد الراء) لکھا نہیں جاتا مگر پڑھا ضرور جاتا ہے ۔ ترکی اور ایران کے مصاحف میں اسے باثبات الف لکھنے کی غلطی عام ہے۔

(۳) کلمہ " فراشا " کے رسم عثمانی میں اختلاف ہے ۔ ابوداؤد سلیمان بن نجاح ۔ کی تصریح کی بناء پر عرب اور افریقی ممالک کے مصاحف میں اسے بحذف الف بعد الراء لکھا جاتا ہے یعنی " فرشًا " کی صورت میں ۔ پھر پڑھنے کے لیے اس محذوف الف کو ضبط کے ذریعے واضح کیا جاتا ہے ۔ لیبیا والے الدانی (م ۴۴۴ ھ) کی عدم تصریح کی بناء پر اسے باثبات الف بعد الراء لکھتے ہیں یعنی " فراشا " اور یہی اس کی املاء معتاد بھی ہے ۔ الدانی نے المقنع میں اور الشاطبی نے (العقیلہ میں) اس لفظ کے محذوف الالف ہونے کا کہیں ذکر نہیں کیا ۔ تمام مشرقی ممالک ۔ ترکی، ایران، برصغیر، چین وغیرہ کے مصاحف میں بھی اسے باثباتِ الف (فراشا) ہی لکھا جاتا ہے مگر ان کے سامنے اہلِ لیبیا والی وجہ نہیں بلکہ غالبًا تساہل یا عام عربی املاء کے اتباع میں یہ رواج ہوگیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ الدانی اور الشاطبی کی خاموشی ہی اس کا سبب بنی ہو ـــــ کیونکہ ابوداؤد کی کتاب " التنزیل " (جو ابھی تک کہیں طبع نہیں ہوئی) کا چرچا عرب اور افریقی ملکوں میں (بالواسطہ ہی سہی مگر) عام ہے جب کہ مشرقی ممالک میں زیادہ تر الدانی اور الشاطبی ہی متعارف ہیں ۔

۲ : ۱۶ : ۴ الضبط

زیرِ مطالعہ دو آیات میں کلمات کے ضبط کا اختلاف مندرجہ ذیل نمونوں سے سمجھا جا سکتا ہے :-

يَاَيُّهَا ، يَاَيُّهَا / النَّاسُ ، النَّاسُ ، اَلنَّاسُ ،

اَلنَّاسُ / اعْبُدُوا ، اعْبُدُوا ، اُعْبُدُوا ، اُعْبُدُوْا

رَبَّكُم / اَلَّذِىْ ، الَّذِى ، اَلَّذِى ، اَلَّذِى / خَلَقَكُمْ

خَلَقَكُمْ / وَالَّذِيْنَ ، اَلَّذِينَ ، اَلَّذِينَ ، اَلَّذِينَ

مِنْ ، مِن ، مِن / قَبْلِكُمْ ، قَبْلِكُمْ (علامت قلقلہ کے ساتھ)

قَبْلِكُمْ / لَعَلَّكُمْ / تَتَّقُوْنَ ، تَتَّقُونَ ، تَتَّقُونَ /

اَلَّذِىْ (مثل سابق) / جَعَلَ لَكُم / اَلْاَرْضَ ، اَلْاَرْضَ ،

اَلْاَرْضَ / فِرَاشاً ، فِراشاً ، فِرَاشاً ، فِرَاشاً (بحذف الف) /

وَّالسَّمَآءَ ، وَالسَّمَآءَ ، والسَّمَآءَ ، وَالسَّمَآءَ / بِنَاءً ، بِنَاءً ،

بِنَاءً / وَّاَنْزَلَ ، وَاَنزَلَ ، وَأَنزَلَ ، وَآنزَلَ / مِنَ ، مِنَ /

السَّمَآءِ (مثل سابق) / مَآءً ، مَآءً ، مَآءً / فَاَخْرَجَ ،

فَأَخْرَجَ ، فَاَخْرَجَ / بِهٖ ، بِهِ ، بِهٖ ، بِهٖ /

مِنَ ، مِنَ / الثَّمَرَاتِ ، اَلثَّمَرَاتِ ، اَلثَّمَرَاتِ /

رِزْقاً لَّكُمْ ، رِزْقاً لَّكُمْ / فَلَا تَجْعَلُوْا ، فَلَا تَجْعَلُوا ،

فَلَا تَجْعَلُوْا ، فَلَا تَجْعَلُوْا / لِلّٰهِ ، لِلّٰهِ ، لِلّٰهِ ، لِلّٰهِ

اَنْدَادًا ، اَندادًا ، أَندادًا / وَّاَنْتُمْ ، وَأَنْتُمْ ،

وَآنتُمْ / تَعْلَمُوْنَ ، تَعْلَمُونَ ، تَعْلَمُونَ ۔

ملحوظ : اختلافِ ضبط کی مندرجہ بالا صورتوں میں ایک دو چیزیں خصوصاً قابل

غور ہیں۔

(۱) تنوین کے ملفوظی نون ساکن کے بعد اگر " یرملون " میں سے کوئی حرف آجائے تو حرفِ منوّن کو تنوین کی ایک حرکت (ـَ ، ـِ یا ـُ) کے ساتھ اس (حرفِ یرملون) میں مدغم کر دیا جاتا ہے اور اس کے لیے اس حرفِ مدغم فیہ پر علامتِ تشدید ڈالی جاتی ہے اس کی مثال آپ نے اوپر " رزقاً لّکُمْ " میں دیکھی ہے۔ اگر ایسے حرف منوّن کے بعد " د " یا " ی " ہو تو اس سے ادغام میں غنہ کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ صرف برصغیر میں ایسی " د " یا " ی " پر علامتِ تشدید ڈالی جاتی ہے۔ جس کی مثالیں آپ نے اوپر " فراشاً وَّ " ، " بناءً وَّ " اور " انداداً وَّ " میں دیکھی ہیں۔ البتہ اس میں غنہ پڑھنے کا طریقہ طالب علم کو زبانی سمجھا دیا جاتا ہے (کہ تنوین یا نون ساکن کے بعد " و " یا " ی " ہو تو " نون " غنہ کے ساتھ پڑھنا چاہیے)۔ پاکستان کے صرف تجویدی قرآن میں اس قسم کی تنوین کے لیے غنہ کی ایک خاص علامت مقرر کی گئی ہے یعنی ـًں ، ـٍں یا ـٌں کی صورت میں۔ عجیب بات ہے کہ عرب اور افریقی ممالک — بلکہ ایران اور ترکی میں بھی — اس قسم کی (تنوین کے بعد آنے والی) " و " یا " ی " پر علامت تشدید نہیں ڈالی جاتی جیسا کہ مندرجہ بالا الفاظ میں آپ نے دیکھا۔ البتہ اس تنوین کو تنوینِ اخفاء (ـً ، ـٍ ، ـٌ) کی شکل دے دی جاتی ہے غالباً وہاں بھی غنہ کا قاعدہ زبانی ہی بتایا جاتا ہوگا کیونکہ یہ تجوید کا ایک اہم قاعدہ ہے اسے قراءت میں نظرانداز تو نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) دوسری قابلِ توجہ بات ہائے کنایہ کا ضبط ہے۔ برصغیر میں یہ ضبط بصورت کسرہ (ـِ) حرکتِ اشباع یعنی کھڑی زیر (ـٖ) سے اور بصورت ضمہ (ـُ) ضمہ معکوس (ـٗ) سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ مثلاً " بِهٖ " اور " لَهٗ " میں — تمام عرب اور افریقی ملکوں میں اس مقصد کے لیے متعلقہ " ها " پر صرف کسرہ (ـِ) اور ضمہ (ـُ) ڈال کر بصورت کسرہ ساتھ ایک باریک سی " ی " یا " ے " سطر سے نیچے یا سطر سے اوپر لکھتے ہیں اور بصورت ضمہ (ـُ) ساتھ ایک باریک سی

"د" اسی طرح (سطر سے اوپر یا نیچے) ڈال دیتے ہیں یہ "د" یا "ی" قلمی دور میں "سرخ سیاہی" سے لکھی جاتی تھی اب دورِ طباعت میں اسے کتابت کے عام قلم کی بجائے باریک قلم سے لکھا جاتا ہے یعنی "بـہ" اور "لَـمُ" کی صورت میں ۔ اس کا نمونہ آیتِ زیرِ مطالعہ کے کلمہ "بـہ" میں دیکھئے ۔

(۳) عرب اور افریقی ممالک کے مصاحف میں نون ساکنہ مخفاۃ (اخفاء کے ساتھ پڑھے جانے والے ساکن نون ۔ یعنی جس کے بعد حرف حلقی نہ ہو) پر علامت سکون ڈالی ہی نہیں جاتی جیسے آپ نے اوپر "انتم"، "اندادًا"، "من" اور "انزلْ" میں ملاحظہ کیا ہوگا بعض مصاحف (مثلاً تجویدی قرآن اور مصحف حلبی) میں اس قسم کے اخفاء کے لیے "نون" پر خاص قسم کی علامتِ سکون ڈالی گئی ہے ۔

(۴) صرف افریقی ممالک میں "ف" کو "ب"، "ق" کو "ف" لکھا جاتا ہے اور کلمہ کے آخر پر آنے والے "ن"، "ی"، "ف" اور "ق" کو نقطوں سے خالی رکھا جاتا ہے اس کی مثالیں آپ نے اوپر "من"، "تتقوں"، "تعلموں" اور "الـذیں" میں ملاحظہ کی ہیں ۔ ایسی مثالیں اس سے پہلے بھی گزر چکی ہیں ۔

(۴) بعض افریقی ممالک کے مصاحف میں "لِلّٰہِ" کو ہر جگہ اس طرح لکھتے ہیں کہ صرف ابتدائی لام اور آخری ھا کی کسرہ (ـِ) لکھ دی جاتی ہے اور درمیانی "لام" کو ہر طرح کی حرکت سے خالی رکھا جاتا ہے یعنی صرف "لِلہِ" لکھتے ہیں اور غانا میں تو اسے لکھتے بھی خاص انداز میں ہیں یعنی بصورت "لِـلہ" (جیسے ہمارے ہاں اردو فارسی میں "اللہ یار" میں لکھتے ہیں) ۔ ویسے وَاللّٰہُ، بِاللّٰہِ وغیرہ میں وہ درمیانی لام پر تشدید اور حرکت ڈالتے ہیں صرف بصورت "لِلہِ" ایسا نہیں کرتے ۔ پڑھنے کا طریقہ غالباً استاد سے زبانی سیکھا جاتا ہوگا ۔

ڈاکٹر طاہر سعید کے نام (۱۲)
ڈاکٹر حافظ محمد مقصود

"اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے"

(گزشتہ سے پیوستہ)

ان جمہوری طریقوں اور انتخابات نے نفاذِ اسلام کے راستے میں جو رکاوٹیں پیدا کی ہیں اُن میں سے چند ایک یہ ہیں :-

اوّلاً یہ کہ ہمارے عوام کی اکثریت عقل و فہم سے عاری اور ہوش و خرد سے خالی ہے۔ ایسے لوگ زندگی کے فیصلے اعلیٰ ترین اقدار کو سامنے رکھ کر نہیں بلکہ وقتی اور عارضی آرام و آسائش کو مدِّ نظر رکھ کر مجرّد جذبات سے کرتے ہیں۔ اور یہ کڑوی حقیقت ہمارے لیے چنداں باعثِ تعجّب نہیں کیونکہ مسلسل دو صدیوں تک انگریز کے سامنے دست بستہ قیام و حضور اور خداوندِ فرنگی کی بدترین اور ذلیل ترین بندگی اور غلامی نے گھٹیا پن اور چھچھور پن کے نہایت زود اثر انجکشن دے کر ہمارے اندر معقولیت، سنجیدگی، مضبوط قوتِ فیصلہ، جواں ہمتی، جذبۂ قربانی، مستقل مزاجی اور شعورِ اسلامی کا جنازہ نکالا ہے۔ اسی قوم کے لوگ ایک عرصۂ دراز تک فرنگی عدالتوں کے جج، فرنگی سینماؤں کے مینیجر اور فرنگی شراب خانوں کے نگہبان رہے ہیں۔ اور آج تک یہ "مقامِ شرم" اُن کے لیے "مقامِ فخر و ناز" ہے۔ معاشرتی اور سیاسی جرائم کی جتنی قسمیں کافر قوموں میں پائی جاتی ہیں، ہماری قوم "لفظِ اسلامی" کے ایک ارزاں اور سستے لائسنس کے ساتھ اُنہی جرائم کا ارتکاب کرنے میں کافروں سے بھی زیادہ بے باک ہے۔ ظاہر ہے ایسی فضا میں اگر انتخابات اور الیکشن کی رو چلے تو ایک اسلامی سمگلر، ایک اسلامی ڈاکو، ایک اسلامی چور اور ایک اسلامی میوزک پلیئر (MUSIC PLAYER) ایک عالمِ دین کو ووٹ دے کر اپنے بنے بنائے کاروبار کا خود دشمن تو کبھی بھی نہیں بن سکتا۔ وہ تو ایک ایسے شخص کو منتخب کر کے

اسمبلی میں بھیجے گا جو اُسے سمگلنگ اور ڈاکے اور چوری کا لائسنس فراہم کر سکے اور اگر بہ ووڑان غلط کاریوں میں کبھی پکڑا گیا تو وہی ایم پی اے یا ایم این اے اس قومی خیانت میں اُس کا باتونی اور چرب زبان وکیل بن سکے۔ چنانچہ اس ملک کی اسمبلیوں پر ایک طائرانہ نگاہ دوڑایئے تو آپ کو رحمت کے فرشتوں کے فقدان اور شرارت کے شیاطین کی فراوانی ہی فراوانی نظر آئے گی جو انسان کے روپ میں جنگلی درندوں کا رول ادا کر رہے ہیں، جنہیں قدرت نے انسانوں کو لوٹنا تو درکنار درندگی اور خونخواری میں شیطانوں کے کان کترنے کا بھی ایک عظیم الشان ملکہ عطا کر رکھا ہے۔

ایک ایسے جمہوری طریقِ کار اور انتخابی سیاست میں اس معجزہ کے وقوع و امکان کی توقع آخر کون رکھ سکتا ہے کہ ایک ایسا معاشرہ جہاں اسّی فیصد لوگ دعوت الی اللہ کی اصلی رُوح سے مدّتوں بیگانہ رہنے کی وجہ سے صرف نسلی و موروثی یا کلمہ گوئی کی حد تک مسلمان ہوں وہاں اُن کے ووٹوں سے پکے اور سچے مسلمان ابھر کر کبھی اسمبلیوں میں پہنچ سکتے ہیں۔ اگر کبھی ایسا ہوتا تو پھر اس ملک میں جہاں کلمہ گو مسلمانوں کا تانتا لگا رہتا ہے ایک سیکولر باپ کی سیکولر بیٹی منتخب ہو کر ایک "منکر" کی شکل میں کیوں مسندِ اقتدار پر متمکن ہو گئی؟ کیا اُن کے منشور میں صاف لکھا ہُوا نہیں کہ طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں اور کیا قرآن کے ایک ایک صفحے پر اس حقیقت کو کھول کر بیان نہیں کیا گیا ہے کہ اللہ کی حاکمیتِ مطلقہ کے تصوّر کو نظر انداز کرتے ہوئے عوام کی طاقت کا نظریہ رکھنا بدترین قسم کا شرک ہے۔

پس یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے جس سے صرف وہی شخص انکار کر سکتا ہے جو لاٹھی لے کر عقل و دانش کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا ہو کہ اسی معاشرہ میں دعوتِ قرآنی کو ثانوی (SECONDARY) حیثیت دے کر نفاذِ اسلام کے نعروں سے عوام کے ووٹ حاصل کرنا گھوڑا گاڑی کو گھوڑے سے آگے (TO PUT THE CART BEFORE THE HORSE) باندھنے کے مترادف ہے، جس معاشرہ میں نظریۂ توحید سے لوگوں کے دماغوں کو مسحور اور دلوں کو مسرور نہ کیا گیا ہو، جہاں ایک نظامِ باطل کی خرابی اُن پر واضح

نہ کی گئی ہو، جو اسلام کی اصلی روح سے قطعی نابلد اور قرآن و سنّت کی بنیادی تعلیمات سے بالکل ناآشنا ہوں وہاں نظامِ باطل کی سرکوبی اور نظامِ حق کی کامرانی کے لیے اُن سے ووٹ حاصل کرنے کی توقع رکھنا عقل و منطق کی کونسی عدالت کی رُو سے درست ہے۔

اِس ساری بحث کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب آپ جماعتِ اسلامی سمیت اپنے ملک کی اسلامی سیاسی جماعتوں پر نگاہ دوڑایئے تو آپ کو صاف نظر آجائے گا کہ یہ جماعتیں جن کا اصل ہدف قرآن و سنّت کی دعوت کو وسیع پیمانے پر پھیلانا اور عوام کی ذہنی اور فکری صفائی کرنا تھا، اُلٹا دین کی حقیقت سے غافل و ناآشنا عوام سے ووٹ حاصل کرنے اور اسمبلی اور پارلیمنٹ کے ذریعے نفاذِ دین کے اُسی آن ہونے معجزے کا انتظار کر رہی ہیں جس کا میں ابھی ذکر کر آیا ہوں۔ چنانچہ الفاظ قلم بند کرتے ہوئے میرا ذہن اچانک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اسٹریچی ہال کی جانب منتقل ہو رہا ہے۔ جہاں جماعتِ اسلامی کے سابق امیر سیّد ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم مغفور نے ۱۲ ستمبر ۱۹۴۰ء کو "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" کے عنوان سے ایک بڑی فکر انگیز اور ایمان افروز تقریر کی تھی، جس میں انہوں نے نہایت واضح اور دوٹوک الفاظ میں فرمایا:

"جمہوری حکومت میں اقتدار اُن لوگوں کے ہاتھ میں آتا ہے جن کو ووٹروں کی پسندیدگی حاصل ہو۔ ووٹروں میں اگر اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر نہیں ہے، اگر وہ صحیح اسلامی کیریکٹر کے عاشق نہیں ہیں، اگر وہ اس بے لاگ عدل اور ان بے لچک اصولوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ جن پر اسلامی حکومت چلائی جاتی ہے تو اُن کے ووٹوں سے کبھی "مسلمان" قسم کے آدمی منتخب ہو کر پارلیمنٹ یا اسمبلی میں نہیں آسکتے۔ اس ذریعہ سے تو اقتدار ان ہی لوگوں کو ملے گا، جو مردم شماری کے رجسٹر میں تو چاہے مسلمان ہو، مگر اپنے نظریات اور طریقِ کار کے اعتبار سے جن کو اسلام کی ہوا بھی نہ لگی ہو۔ اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کے

معنی یہ ہیں کہ ہم اس مقام پر کھڑے ہیں جس مقام پر غیر مسلم حکومت میں تھے، بلکہ اس سے بھی بدتر مقام پر — کیونکہ وہ "قومی حکومت" جس پر اسلام کا نمائشی لیبل لگا ہوگا، اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے میں اس سے بھی زیادہ جری و بے باک ہوگی جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے۔ غیر مسلم حکومت جن کاموں پر قید کی سزا دیتی ہے "مسلم قومی حکومت" ان کی سزا پھانسی اور جلاوطنی کی صورت میں دے گی اور پھر بھی اس حکومت کے لیڈر جیتے جی غازی اور مرنے کے بعد رحمۃ اللہ علیہ رہیں گے۔ پس یہ سمجھنا قطعی غلط ہے کہ اس قسم کی "قومی حکومت" کسی معنی میں بھی اسلامی انقلاب لانے میں مددگار ہوسکتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر ہم کو اس حکومت میں بھی اجتماعی زندگی کی بنیاد بدلنے ہی کی کوشش کرنی پڑے گی اور اگر ہمیں یہ کام حکومت کی مدد کے بغیر بلکہ اس کی مزاحمت کے باوجود اپنی قربانیوں ہی سے کرنا ہوگا۔ تو آج ہی سے یہ راہ عمل کیوں نہ اختیار کریں؟۔ اس نام نہاد "قومی حکومت" کے انتظار میں اپنا وقت یا اس کے قیام کی کوشش میں اپنی قوت ضائع کرنے کی حماقت آخر ہم کیوں کریں۔ جب کہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ وہ ہمارے مقصد کے لیے نہ صرف غیر مفید ہوگی، بلکہ کچھ زیادہ ہی سدّ راہ ثابت ہوگی۔"

دیکھا آپ نے کیسے زوردار لہجے میں سیّد مودودی مرحوم جمہوری طریق کار یا انتخابی سیاست کو ایک شجرِ ممنوعہ قرار دے کر اس کی بھرپور نفی کر رہے ہیں۔

ے پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو
ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اِک ثمر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاکِ کاشغر
تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

(باقی صفحہ ۴۸ پر)